Telegrams: "ANJUMAN"

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۱ - شمارہ ۱۲ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | علی گڑھ ۲۲ مارچ ۱۹۶۲ء

قاضی معراج دھولپوری

بسلسلۂ ذکرِ آزاد

۲۲ فروری ۱۹۶۲ء کے اخبار "ہماری زبان" میں ایک مضمون بعنوان "ذکرِ آزاد" جناب محمد عتیق صاحب صدیقی کا نتیجۂ قلم نظر نواز ہوا جس میں مولانا آزاد کو "لسان الصدق" کے مدیر ہونے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ نیز ان کا "پہلے پہل علمی و ادبی دنیا سے روشناس" ہونا بتایا گیا ہے جو میرے خیال میں احتمال سے خالی نہیں کیونکہ حلقۂ علم و ادب میں روشناس ہوئے بغیر براہ راست ادارت کی ذمہ داریوں کو سنبھال لینے کا اہل بن جانا کچھ قرین قیاس نہیں۔ اہل قلم پہلے اپنی نمایاں کاری اور صلاحیتوں کے ذریعے شہرت و مقبولیت کی منزلیں طے کرتا ہے ازاں بعد کسی رسالے کی ادارت کا فخر اس کو حاصل ہوتا ہے چنانچہ مولانا آزاد کے متعلق بھی اس امر کی مادی شہادت موجود ہے۔ ماہ جولائی ۱۹۰۲ء کے "مرقع عالم" (صفحہ) میں آپ کا ایک مراسلہ اس وقت پیش نظر ہے جس میں "علوم جدیدہ اور اسلام" کے زیر عنوان ایک مضمون کا بھی اشاعت کے لئے رسالۂ مذکور کو بھیجا جانا ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ جس کا چار قسطوں پر مشتمل ہونا خط سے معلوم ہوتا ہے منجملہ ان کے دو قسطوں کا خط کے ساتھ ارسال کرنا اور تیسری چوتھی قسط کا عن قریب بھیجا جانا قلم بند کیا گیا ہے۔ تحریک اس مضمون کی علوم مغربی بالخصوص سائنس سے متعلق مضامین مطبوعہ مرقع عالم سے ہوئی تھی جن کے لئے "محمد عمر بادی اجمیری دروازہ بریلی" کے اصرار کی تعمیل میں آٹھ صفحات کا اضافہ کرنا جناب مدیر نے منظور کیا تھا۔ آغاز اس سلسلے کا جنوری ۱۹۰۲ء سے عمل میں آیا۔ چنانچہ فروری سال مذکور میں یہ مضامین داخل رسالہ نظر آتے ہیں۔

مولانا کو ان مضامین سے دہریت اور لامذہبیت کے بڑھتے ہوئے مرض کے انسداد کا خیال پیدا ہوا جس کے زیر اثر مضمون مذکور بغرض اشاعت رسالے کو بھیجا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام سائنس کے عین مطابق ہے۔

بجز مضمون کے علاوہ اسی خط کے متن میں "ایڈیٹر مرقع عالم حکیم محمد علی خاں آنریری مجسٹریٹ ہردوئی (اودھ)" کی "تمام تصانیف پر ایک ریویو" کا حوالہ قلم کیا جانا بھی مرقوم ہے۔ جس کو اسی رسالے میں بغرض اشاعت بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ جولائی کے بعد کے پرچے چونکہ اس وقت سامنے نہیں اس لئے اس ریویو اور مذکور الصدر مضمون کی اشاعت و عدم اشاعت کے بارے میں تیقن کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ رسائل مابعد میں یہ سارا مواد مطبوعہ موجود ہو۔ بہر حال ۱۹۰۳ء سے قبل مولانا کا حلقۂ علم و ادب میں روشناس ہو جانا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ سال کی تھی۔ کیونکہ مرحوم نے اپنی گراں قدر تصنیف "تذکرہ" میں "۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ" اپنا سال ولادت بتایا ہے۔ ہجری سال کا حامل "فیروز بخت" آپ کا تاریخی نام ہے۔

مراسلۂ زیر بحث "۱۱ جون ۱۹۰۲ء یوم الاربعہ" کا تحریر کردہ ہے اور کلکتہ "امرتلہ لین" سے ارسال کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں "خادم احباب ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ" ثبت ہے۔ مطالعے کے لئے ذیل میں خط کی بجنسہٖ نقل ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے:—

"باسمہ سبحانہ

۱۱ جون ۱۹۰۲ء یوم الاربعہ

جناب حکیم صاحب! السلام علیکم و علی من لدیکم

مجھے آپ کے مرقع عالم سے کس قدر شفقت ہے؟ اس کا آپ

اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ بمبئی میں مرقع عالم سنین ماضیہ کے پرچے جب میں نے طلب کئے تھے اور کارپردازوں کی غفلت کے سبب سے فرمائش کی جلد تعمیل نہ ہوئی تھی تو اس وقت میں نے متواتر رجسٹرڈ خطوط روانہ کئے تھے یعنی طبیعت میں اس کا ایک شوق بڑھا ہوا تھا اور بدگمانی اس امر کا موقع ہی نہیں دیتی تھی کہ خطا کے پہنچنے کو تسلیم کرکے عدم تعمیل فرمائش کو کسی اور وجہ پر محمول کرتا۔ اگرچہ رجسٹرڈ خطوں کا کسی چیز کے فرمائش کے لئے ارسال کرنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ مگر ایک ایسی حالت میں کہ ناقدردانی کی گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہو اور لوگوں کو ایک کارڈ بھیجنا بھی بار گذرتا ہو اس قدر اشتیاق کا ہونا کہ فرمائش کے لئے بیرنگ خطوں اور کارڈوں پر نہ بھروسہ کرکے متواتر رجسٹرڈ خطوں کا ارسال کرنا ایک خصوصیت کا پہلو رکھتا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے میں بڑی حسرت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی علالت کی وجہ سے مرقع عالم اپنی ایک خاص صفت کو جو اور ہندوستانی میگزینوں میں اس کے لئے مابہ الامتیاز تھی، کھو بیٹھا ہے۔ اس سے پبلک کو وہ توجہ جو پچھلے دنوں اس کی طرف مبذول تھی ایک حد تک جاتی رہی ہے وہ کیا؟ پرچوں کی یعنی پابندی وقت۔ پس للہ ذرا آپ ادھر متوجہ ہوں اور ایک سال کا جو آپ پر قرض باقی ہے۔ اسے جلد جلد ادا کرکے آئندہ سے اس میں پابندی کا موثر جادو پیدا کردیں۔

"اس عریضہ کے ہمراہ ایک مضمون علوم جدیدہ اور اسلام کے عنوان سے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ اسے مرقع میں شائع کیجئے انشاء اللہ نمبر ۳ و نمبر ۴ بھی عنقریب ارسال خدمت عالی کروں گا۔

"آپ جانتے ہیں اور یقیناً مجھ سے اچھا جانتے ہیں کہ تحریک تعلیم انگریزی کی اشاعت سے کیا غرض تھی؟ اشاعت علوم مغربی مگر افسوس ہے کہ یہ غرض تو حاصل نہ ہوئی اور انگریزی ذریعہ ملازمت سمجھ لی گئی۔ اب نہ کوئی سائنس سے غرض ہے اور نہ فلسفہ سے بس انٹرنس یا ایف اے تک انگریزی حاصل کی اور دس[1] روپیہ پر ملازم ہو گئے۔ پس حالت موجودہ کے لحاظ سے اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اپنی ملکی زبان میں علوم مغربی کا ترجمہ کیا جائے اور سین ٹیفک سوسائٹی اور پنجاب یونیورسٹی کی پالیسی سے اتفاق کیا جائے۔

"مولوی محمد عمر صاحب نے واقعی یہ بہت ہی اچھا کیا کہ مرقع عالم کو علوم مغربی کا مخزن بنایا۔ ملک اور قوم کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے مگر ساتھ ہی اگر آپ غور کریں گے تو اشاعت علوم مغربی سے ایک اور زہریلا مرض ہندوستان میں پھیل رہا ہے اور جب اس میں ترقی ہوگی تو اس میں بھی یقیناً ہوگی۔ پس اس لئے ضرور ہے کہ اس کا انسداد بھی قبل از وقت کرلیا جائے۔ آپ کہیں گے وہ کون سا مرض ہے؟ حضرت! وہ دہریت اور لامذہبیت کا مرض ہے جو مذہب کی پاک زندگانی کا تمام کردیا ہے[1]۔ اور جس نے یورپ کو مذاہب کی قید سے آزاد کردیا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اسلام کو ناواقفوں نے سائنس کے خلاف سمجھ لیا ہے اس لئے انھیں مذہب سے خلاف کرنا ضروری ہے۔ میں نے اس خیال سے کہ جب مرقع عالم میں سائنس کے تراجم شائع ہو رہے ہیں تو ان کے خرابیوں کا انسداد بھی ضرور بالضرور ہونا چاہیئے۔ یہ مضمون علوم جدیدہ اور اسلام آپ کے پرچے کے لئے بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ ناظرین کے لئے باعث دلچسپی ہوگا اور وہ اسے غور و فکر کے ساتھ پڑھیں گے۔ مرقع عالم کے غالباً ہزار سے زیادہ خریدار ہوں گے کیا ہزار میں سے نصف پانچ سو بھی ایسے ہوں گے جنھیں اس کی توسیع اشاعت کا خیال ہو؟ میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر ایک صاحب احباب خریداروں سے ایک ماہ کے اندر پانچ خریداروں کے بہم پہنچانے کا ذمہ لے اور اگر وہ مہینہ کے اندر نہ بہم پہنچا سکے تو دس روپیہ دے کر پانچ پرچے خریدے اس کا اسے اختیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس تجویز پر محبان علوم غور فرما کر عمل فرمائیں گے کیونکہ جب تک ایسا خیال ہماری قوم میں نہ ہوگا کبھی علمی ترقی نہیں ہوسکتی۔

"میں نے آپ کی تمام تصانیف پر ایک ریویو بھی لکھا ہے اسے بھی عنقریب ارسال کروں گا جس سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مرقع عالم کیا چیز ہے؟ اور ہم اس کی کیسی ناقدردانی کر رہے ہیں۔"

از کلکتہ امرتلا لین

زیادہ نیاز
خادم احباب
ابو الکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

نقل کردہ مذکورہ بالا خط میں ہائے مخلوط کہیں استعمال نہیں کی گئی۔ اس کے بجائے ہر مقام پر "ہائے دار" "ہ" سے کام لیا گیا ہے۔ نیز املا بھی سوائے ایک لفظ "پرچے" کے اور کہیں نہیں کیا گیا۔ سوالیہ نشان البتہ ہر سوال کے بعد بپابندی بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر فجائیہ کا استعمال بھی نظر آتا ہے کہ یہی ایک مقام اس کا مقتضی تھا۔

ایک قلم کے ختم کرنے کے بعد جب دوسرے قلم کا آغاز کیا گیا ہے تو حاشئے کے بالکل متصل سے شروع کیا گیا ہے۔ حاشئے سے ہٹ کر نہیں جیسا کہ آجکل دستور ہے۔

مولانا کے علمی و ادبی خطوط کا ایک مجموعہ "غبار خاطر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مذکورۂ بالا قسم کے خطوط کا کوئی مجموعہ موجود نہیں[1]۔ اگر اس قسم کے خطوط دستیاب ہوسکیں تو ان کا مجموعہ بھی ادبی حلقے کے لئے مفید ثابت ہوگا نیز متعدد بصیرت افروز نتائج ان سے اخذ کئے جا سکیں گے۔

[1] غبار خاطر کے علاوہ مولانا آزاد کے مکاتیب کے دو اور مجموعے غلام رسول صاحب مہر نے "نقش آزاد" اور "تبرکات آزاد" کے نام سے شائع کئے ہیں۔ اول الذکر مجموعے کے تمام خطوط علمی و مذہبی ہیں اور آخر الذکر میں کچھ سیاسی خطوط بھی شامل ہیں۔ (ادارہ)

[1] یہ جملہ [illegible] کے ساتھ اسی طرح ہے ۱۲

ہماری زبان

۲۲ مارچ ۱۹۷۲ء

ہماری جمہوریت

رسالہ شاعر بمبئی نے حال میں اپنا جمہوریت نمبر شایع کیا ہے۔ اس میں جمہوریت اور عوام' ہندی میں اردو' پیغام' جمہوریت' جمہوریت چند حقایق' اردو ادب کا جمہوری کردار اور دستور ہند کے چند خاص نکات کے عنوانوں سے جو مضامین درج ہیں وہ غور سے پڑھے جانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک تمام اقلیتوں کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ ان کے لئے بھی سب کے برابر ترقی کے امکانات ہیں خصوصاً زبانوں کے معاملے میں پالیسی سے قطع نظر عمل دیکھا جاتا ہے اور اگر عمل کی دنیا میں کوتاہی ہوتی ہے تو پالیسی کتنی ہی اچھی ہو لوگ اس سے بدظن ہو جاتے ہیں اور اس بدظنی اور بدگمانی کا اثر سماجی صحت پر پڑتا ہے۔

اس سلسلے میں چند حقایق اور بھی ہیں جن کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ حقایق اچھے ہوں یا بُرے' ان سے آنکھیں چار کرنے کی جرات ہونی چاہیئے تاکہ ان کے ناگوار پہلوؤں کو دور کرنے کی سعی ہو سکے اور اچھے پہلوؤں کو مضبوط کیا جا سکے۔

ابھی ہمارا تیسرا عام چناؤ ختم ہوا ہے۔ دنیا میں اتنے بڑے چناؤ کی مثال نہ ملے گی۔ عام طور پر یہ نہایت پر امن طریقے سے ہوا ووٹروں کی تعداد' کارکنوں' امیدواروں' کامیاب اشخاص' پارٹیوں انتظامات سب کے متعلق ایسی باتیں کہی جا سکتی ہیں جن سے باہر والوں کو اس انتخاب کے خوش اسلوبی سے ختم ہونے پر حیرت ہو لیکن اس سلسلے میں ہمارے تاثرات حسب ذیل ہیں:

(۱) ملک کو اب بھی پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگریس پر سب سے زیادہ بھروسہ ہے۔ پنڈت جی کے خیالات سے اسے بڑی حد تک اتفاق ہے۔ جمہوریت کی ترقی کے لئے جو راستہ پنڈت جی نے بنایا ہے اس پر چلنے کے لئے وہ تیار ہے۔

(۲) اس کے باوجود کچھ ریاستوں میں دائیں بازو کی طاقتیں ابھر رہی ہیں اور کچھ میں بائیں بازو کی۔ اگرچہ اس کی وجہ موجودہ صورت حال میں فوری تبدیلی کا امکان کم ہے لیکن آئندہ تبدیلی کے امکانات قوی ہیں۔

(۳) جیسا کہ اخبار اسٹیٹس مین کے ایک نمائندے نے کہا ہے یہ بات معنی خیز ہے کہ ہندی کی ریاستوں میں جن سنگھ کا عروج ہوا ہے اور وہ اب ایک ایسی طاقت ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) مدراس اور پنجاب میں ایسی پارٹیاں ابھر رہی ہیں جنھیں قومی مسئلے سے زیادہ علاقائی مسائل سے دلچسپی ہے۔

(۵) سوتنتر پارٹی جو سوشلزم اور منصوبہ بندی کے خلاف ہے اس انتخاب میں کئی ریاستی اسمبلیوں میں ایک اچھی خاصی طاقت بن گئی ہے۔

(۶) اگرچہ ہر پارٹی نے اپنے انتخابی منشور شایع کئے اور لیڈروں نے سیاسی مسائل پر تقریریں کیں' مگر ووٹ کے معاملے میں زیادہ تر ان جذبات نے کام کیا جو جمہوریت کی روح کے منافی ہیں۔

(۷) پارٹیوں میں گروہ بندی کے اثرات خاصے نمایاں ہوئے سب سے بڑی سیاسی پارٹی کانگریس خاص طور پر اس کا شکار رہی۔ اس گروہ بندی کے پیچھے اگر سیاسی اختلافات ہوتے تو یہ اچھا ہوتا۔ مگر اختلافات ذاتی تھے اور صرف طاقت حاصل کرنے کے لئے تھے۔

(۸) امیدواروں نے مذہب' ذات پات' علاقائی تعصب' سب سے کام لیا۔ ہر جگہ ایسا نہیں ہوا۔ مگر خاصے بڑے پیمانے پر ایسا ضرور ہوا۔

(۹) ووٹ کے معاملے میں ایک حد تک افراد نے سیاسی سوجھ بوجھ کا ثبوت ضرور دیا۔ مگر زیادہ تر ووٹ مذہب' ذات پات اور علاقائی پاس داری کی بنا پر ڈالے گئے۔

(۱۰) برادری کے پنچوں' گاؤں کے معزز لوگوں' خاندان کے سربرآوردہ افراد' مختلف جاتیوں کے لیڈروں کی خاصی اہمیت رہی۔ ہر شخص خود سوچ سمجھ کر فیصلہ نہ کر پایا۔

(۱۱) ملک کا بہت روپیہ اور بہت سا قیمتی وقت صرف ہوا۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اچھی طرح صرف ہوا۔

(۱۲) اس انتخاب کے بعد تمام سیاسی پارٹیوں کو چاہیئے کہ جمہوریت کو باقی رکھنے کے لئے جو کہیں وہ کریں۔ مذہبی اختلافات کو نظر انداز کریں' ذات پات کے فرق پر دھیان نہ دیں' ایک زبان کے ساتھ وفاداری کے جذبات کو اس طرح نہ بھڑکائیں کہ دوسری زبانوں کے ساتھ بے انصافی کا جذبہ ابھرے' صحیح معنی میں جمہوریت کا دامن پکڑیں اور جمہوریت کا نام لے کر عوام کو فریب نہ دیں۔

(۱۳) کیا وجہ ہے کہ ہمارا نصب العین صحیح ہے' ہمارا طریقۂ کار بھی اچھا ہے' ہمارے اصول بھی لایق احترام ہیں' ہمارے خیالات بھی قابل قدر ہیں' مگر عمل میں بڑا فرق ہے۔ کیا یہ فرق ایک خطرہ نہیں ہے؟

(۱۴) کیا اب وقت نہیں کہ اس خلیج کو کسی نہ کسی طرح پاٹا جائے تاکہ ملک کی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اور ہم ملک میں ایک ایسی جمہوری اور غیر مذہبی ریاست کو مستحکم کر سکیں جو سوشلزم کی منزل تک ہمیں جلد سے جلد لے جا سکے۔

انجمن ترقی اردو شاخ دہلی

مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت

۱۳ مارچ کی شام کو دہلی پبلک لائبریری میں انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کی جانب سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض لالہ شام ناتھ میئر دہلی کارپوریشن نے ادا کئے۔ لالہ جی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ مولانا نے ملک و قوم کی جو خدمت کی وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائے گی۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں ان کا ثانی تو مشکل سے ملے گا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ۳۳ یا ۳۴ سال کی عمر میں منتخب ہوئے اور اس وقت کانگریس قدم قدم پر انگریزی سامراج سے ٹکرا رہی تھی انھوں نے اس خوش اسلوبی سے کام کیا اور ایسے استقلال کا ثبوت دیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مجھے شرف نیازمندی سات یا آٹھ سال ان سے حاصل رہا۔ جب بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ دلی کے لئے درپیش ہوا میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے ناخن تدبیر سے منٹوں میں الجھے ہوئے معاملات کو سلجھا دیتے تھے مولانا انسانی نفسیات کے بہت بڑے نباض اور انسان شناس تھے۔ ان کی نظر میں بڑی گہرائی اور وسعت تھی۔ حضرت مولانا کو یاد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے اصولوں کو اپنائیں۔ وہ عمر بھر قومی ایکتا کے لئے کام کرتے رہے اور مرتے دم تک ان کی کوشش یہی رہی کہ تعصب کا برا مرض ہندوستان سے دور ہو جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم اپنے ملک کے اچھے لوگوں کے گن تو گاتے ہیں اور ان کی یاد میں جلسے بھی کرتے ہیں، لیکن ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہمارا ملک سیکڑوں سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معاملوں میں پڑ کر یا ذات پات اور زبان و نسل کے قصوں میں الجھ کر بڑے کام ہم بالکل نہیں کر سکتے۔ یہ صورت حالات افسوسناک ہے۔ اگر ہمیں حضرت مولانا کے ساتھ دلی عقیدت ہے تو آئیے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں اسی میں ہی اپنا، قوم کا اور ملک کا بھلا ہے۔

پنڈت سندر لال صاحب نے اپنے پرانے رفیق کو یاد کرتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں فرمایا کہ مولانا بہت بلند درجے کے مسلمان تھے، بظاہر وہ ایسے نظر نہیں آتے تھے لیکن وہ وسیع المشرب صوفی منش اور سچے مومن تھے۔ مولانا کی وفات سے ملک و قوم کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اب پنڈت نہرو کو ان کی طرح مشورہ دینے والا کوئی نہیں رہا۔ مولانا میں یہ عادت بہت اچھی تھی کہ گاندھی جی کی طرح وہ اپنی غلطیاں مان لیا کرتے تھے۔

احسن صاحب نے فرمایا کہ مولانا آزاد کی علمیت و قابلیت کے متعلق کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے وہ جتنے بڑے انسان تھے اتنے ہی بڑے صحافی، ادیب، خطیب اور عالم بھی تھے۔ سیاست کا تو وقار ہی ان کے دم قدم سے تھا۔ مولانا کو ایک ایسے پہاڑ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس سے ٹکراتے ہوئے طوفان حوادث گزر جائیں اور اس کو جنبش نہ ہو۔ جہاں تک ان کی خطابت کا تعلق ہے، بقول ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب "مولانا موتی بھی اگلتے تھے اور انگارے بھی"۔

ظفر پیامی صاحب نے اپنی تقریر میں اس کی شکایت کی کہ ہم نئی نسل کے لوگوں کو مولانا آزاد کے متعلق بہت کم مواد ملتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مولانا کے مضامین اور ان کی تصانیف کی معقول اشاعت کا جلد سے جلد اہتمام کیا جائے۔

جن شعراء نے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا ان میں تلوک چند محروم، روشن صدیقی اور جگن ناتھ آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔

ٹیلی ویژن میں پنڈت نہرو کی کہانی

نئی دہلی ۱۳ مارچ۔ پنڈت نہرو کے بارے میں بی بی سی نے ٹیلی ویژن پر فلم دکھائی تھی اسے لندن کے لوگوں نے غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ اب یہ فلم کل بی بی سی کے ٹیلی ویژن ڈائرکٹر یہاں آئیں گے۔ وہ اپنے ساتھ اس فلم کی ایک کاپی پنڈت نہرو کو پیش کرنے کے لئے لا رہے ہیں۔ یہ فلم بدھ کی شام کو پنڈت نہرو کو پیش کی جائے گی۔ اس سے پہلے یہ فلم نئی دہلی میں منتخب حضرات کو دکھائی جائے گی۔ پنڈت نہرو نے تاہنوز یہ فلم نہیں دیکھی مگر عدیم الفرصتی کے باعث وہ اس فلمی شو میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے بعد یہ فلم نجی طور پر ان کو دکھائی جائے گی۔

ڈاکٹر کاٹجو اجین میں آشرم قائم کریں گے

بھوپال ۱۳ مارچ۔ ڈاکٹر کاٹجو نے "جن کو عام انتخابات میں کامیابی نہیں ہو سکی ہے" ایک بیان میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس انتخابی شکست نے ان کی سیاسی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے اور اب اجین میں وہ ایک آشرم قائم کریں گے۔ اس آشرم میں ایک تعلیمی ادارہ بھی ہوگا جہاں ذریعہ تعلیم سنسکرت زبان ہوگی۔ اس سلسلے میں تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے امداد کی اپیل کی ہے اور ان سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔

ادریس احمد درانی

امتحاں

میں شمعِ علم کا پروانہ ہوں، پجاری ہوں
زبان و لفظ و قلم سے مجھے محبت ہے
ہیں دل نشیں یہ در و بام درس گاہوں کے
مری نگاہ مرے دل میں ان کی عظمت ہے

نگارشں سے بھی اتنا ہی پیار ہے مجھ کو
کہ جتنا پیار مجھے اپنی ماں بہن سے ہے
اسی کا نام لیا، میں جہاں جہاں بھی گیا
کہ مجھ کو عشق بہت اس کے بانکپن سے ہے

میں کالجوں کو نئی منزلیں سمجھتا ہوں
متاعِ علم جہاں دل کو سونپی جاتی ہے
جہاں حیات کے انجان راستوں کے لئے
بشر کے ہاتھ میں اک شمع تھما دی جاتی ہے

وہ شمع جس کی حسین لَو اندھیری راتوں میں
بشر کے شکر و پرچم کے ساتھ چلتی ہے
نشان بن کے ابھرتی ہے صبحِ فردا کا
افق سے صورتِ مہرِ مبیں نکلتی ہے

مگر زباں پہ مری کچھ گلے بھی ہیں اے دوست
میں اپنی لے میں جنھیں اب بیان کرتا ہوں
مجھے معاف کریں اہلِ دانش و بینش
کہ میں بیاں میں حقیقت کا رنگ بھرتا ہوں

میں اپنا خون سکھاتا ہوں کیا اسی کے لئے
کہ زندگی مری ناکامیوں کا منہ دیکھے
یہ محنتیں بھی میں کرتا ہوں کیا اسی کے لئے
کہ مجھ کو ان کا کوئی ثمرہ کوئی پھل نہ ملے

مجھے لگا ہے کہ اس رسمِ امتحاں کے سبب
حیاتِ تازہ مری گلفشاں نہیں ہوتی
پلا کے دل کا لہو جس کی پرورش کی ہے
وہ آرزوئے جواں کامراں نہیں ہوتی

نصاب کی یہ کتابیں نہیں ہیں ناگن ہیں
جو مری روح کو دن رات ڈستی رہتی ہیں
کسی کی یاد، کسی کے خیال کے بدلے
یہی کتابیں تخیل میں بستی رہتی ہیں۔

نہ اس کے جسم کی خوشبو، نہ اس کے قرب کی آنچ
نہ اس کا پیکرِ نازک، نہ اس کی خلوتِ ناز
نہ اس کی کاکلِ عنبر سرشت نظروں میں
نہ اس کے حسن کا محجوب و دل ربا انداز

حیات کتنی حسین و جمیل ہے، پھر بھی
بغیر ساقی و صہبا کے گذری جاتی ہے
جو عمر لذتِ فکر و نظر کے قابل تھی
وہ امتحاں کے تصور میں بیتی جاتی ہے

غزل

منشاء الرحمٰن خاں منشاء

نگاہِ مہر کے مارو ہمیں فریب نہ دو
فلک کے چاند ستارو ہمیں فریب نہ دو

ہمیں یقین ہے نگارِ سحر کی آمد کا
تم اپنی رات گذارو ہمیں فریب نہ دو

مآلِ غنچہ و گل خوب جانتے ہیں ہم
چمن کی تازہ بہارو ہمیں فریب نہ دو

تمھاری چشمِ کرم کا ہے اور ہی منشاء
خدا کے واسطے یارو ہمیں فریب نہ دو

ذکاء الدین شایاں

بس آج کی رات اسی کے کرم کی بات کرو
رفیقو! اپنی وفاؤں کا نام تک بھی نہ لو

ابھی تو عشق کو دینا ہے درد و غم کا حساب
ابھی کچھ اور دنوں اس کی آرزو میں جیو

نہ جانے کب ہو ملاقات وقتِ رخصت ہے
نگاہِ ناز سے دل والو کچھ تو کہو سن لو

بہت ہوئیں غمِ دوراں کی تلخ تر باتیں
کچھ اس نگاہِ محبت کا تذکرہ بھی تو ہو

تاباں پشاوری

لطفِ مے، رنگِ خرابات ہمیں یاد نہیں
چشمِ ساقی کی عنایات ہمیں یاد نہیں

خود فراموشی و مستی کا یہ عالم توبہ
اہلِ دانش کی کوئی بات ہمیں یاد نہیں

جو تری بارگہہ ناز میں ہو جائیں قبول
وہ دعائیں وہ مناجات ہمیں یاد نہیں

زندگانی بھی ہے اک سوزِ مسلسل تاباں
کوئی آرام کے لمحات ہمیں یاد نہیں

ارشد علی نظامی مانجوی

رہِ طلب میں جب پاؤں ڈگمگائے ہیں
ترے خیال نے مژدے وہیں سنائے ہیں

انھیں کو عظمتِ دیوانگی ہوئی حاصل
جو سوئے دار و رسن مسکرا کے آئے ہیں

ہو خیر اہلِ چمن کی کہاں گری بجلی
الٰہی شعلے مرے آشیاں تک آئے ہیں

غمِ حبیب تک ارشد نہیں ہوں میں محدود
مرے قریب غمِ دو جہاں بھی آئے ہیں

کیف سرامپوری

سامنے تو تھا تو دنیا تھی نظر کے سامنے
اب نہیں کچھ مجھ کو دنیا کی خبر تیرے بغیر

ہوں کبھی گھر میں کبھی گلشن میں صحرا میں کبھی
جی نہیں لگتا کہیں اے فتنہ گر تیرے بغیر

میکدہ سونا، چمن ویراں، اندھیرا ہر طرف
تو بتا اے دوست اب جاؤں کدھر تیرے بغیر

سعادت نظیر

مولانا متین کے مقالات

اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہو کر اپنے بل بوتے پر شوقِ کامل اور جہدِ مسلسل سے اپنے نصب العین کی تکمیل کرنے والے حیدرآباد کے ادیبوں میں مولانا ابو المحاسن محمد محسن خاں متین مرحوم بھی تھے۔ ان کا ادبی ذوق سلجھا ہوا تھا، ان کی ادبی زندگی کا آغاز تو شعر گوئی سے ہوا مگر بعد میں نثر نگاری کے جادو اثر حسن نے انھیں اپنا ایسا گرویدہ کر لیا کہ وہ اسی کے ہو رہے اور اپنا ایک طرز پیدا کر لیا جو شائستگی، سنجیدگی اور سادگی سے عبارت ہے۔ ان کا اسلوبِ تحریر علمی و تحقیقی ہونے کے باوجود عیبِ ثقالت سے پاک اور ایک لطیف دلکشی کا حامل ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"تاریخِ عالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اول اول عالمِ شہود میں آیا تو وہ نہایت درماندہ و عاجز تھا، اولین فکر جو اسے دامن گیر ہوئی وہ کھانے، پینے اور رہنے سہنے کی تھی۔ ابتداً وہ غاروں اور درختوں میں پناہ لیتا رہا جب "عہدِ حجری" شروع ہوا تو وہ جانوروں کے شکار پر اپنی زندگی بسر کرنے لگا، کھالوں سے خیمے بنائے، اس کے بعد مٹی کے گھر اور پتوں ڈالیوں سے جھونپڑے تیار کئے، رفتہ رفتہ تمدن اس قدر بڑھا کہ پتوں سے گھر بنائے اور تعددِ نسل کے باعث بستیوں اور شہروں کی ضرورت لاحق ہوئی اس طرح دنیا میں تعمیر فن کا آغاز ہوا گو ابتدا میں عمارتوں کی وضع قطع بے ڈھول اور بھدی تھی لیکن بعد میں درست ہو گئی۔" (حیدرآباد کی تعمیر کاری: پہلے باب کا پہلا پیراگراف)

افسانہ نگاری اور ناول نویسی کے میدان بہت وسیع ہیں۔ ان میں ہر صاحبِ قلم کے لئے اپنی اپنی وسعتِ علم اور روانیٔ طبع کی کارفرمائی سے دل کھول کر خامہ آرائی کے جوہر دکھانے کی کوشش کرنا آسان ہوتا ہے، مگر اس کے برخلاف فنی موضوع پر جو روکھے پن کی حد تک سنجیدہ ہوتے ہیں جن پر انشا پردازی کی بہت کم گنجائش ہوتی ہے، لکھنے میں دلچسپی پیدا کرنا یا کم سے کم ان کو اتنا دلچسپ بنانا کہ پڑھنے والا اکتا نہ جائے بہت مشکل ہے، اتفاق وقت کے تقاضے، جذبۂ افادیت یا عالمانہ دور اندیشی کہ مولانا متین نے جتنے مضامین پر قلم اٹھایا اور ترجمے کئے ہیں وہ باستثنائے چند تاریخی و فنی ہیں اور تقریباً ہر مضمون کو مولانا متین نے اپنی طبعی صلاحیتوں کی مدد سے اپنے قلم کا پورا پورا زور صرف کرتے ہوئے مناسب حد تک دل آویز بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی مضمون نگار ایک صاحبِ طرز انشا پرداز کہلانے کا صحیح طور پر مستحق ہے۔

مرحوم کے ادبی شہ پاروں کو اکٹھا کرنا فی الحال مشکل ہے، بہ مشتے نمونہ از خروارے میری حدِ علم میں ان کی جو تحقیقات ہیں ان میں سے چند کا یہاں اجمالاً ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔ اشاراتِ انجام: مجلۂ مکتبہ، جلد (۱) شمارہ (۲) بابت تیر ۱۳۳۷ف م ۱۹۲۸ء، ضخامت (۱۶ صفحہ)

اردو پنکچویشن (Punctuation) پر سب سے پہلا علمی اور تحقیقی مقالہ ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد ایم۔اے، پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ الہ آباد نے انگلستان سے لکھا کہ یہ مضمون نہایت دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہے، قابل مضمون نگار نے جو اصطلاحات پیش کی ہیں مجھے اکثر سے اتفاق ہے۔ موصوف کی یہ رائے "علاماتِ وقف" کے عنوان سے مجلۂ مکتبہ جلد (۱) شمارہ بابت مہر ۱۳۳۷ف شائع ہوئی ہے۔

۲۔ اشاراتِ انجام پر ایک تفصیلی نظر: مجلۂ مکتبہ، جلد (۲) شمارہ (۵) بابت فروری ۱۳۳۸ف م فروری ۱۹۲۹ء ضخامت (۱۶ صفحہ)

یہ مضمون اشاراتِ انجام کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں ان کے بعض مباحث پر غور کر کے اصطلاح کی موزونیت کو لسانی نقطۂ نظر سے ثابت کیا گیا ہے اور آخر میں اشاراتِ انجام اور ان کے محلِ استعمال کا ایک مفید ترین نقشہ دیا گیا ہے۔

۳۔ عہدِ عثمانی میں علمی اور تعلیمی ترقی: روزنامہ صبحِ دکن کا سالگرہ نمبر ۱۳۳۹ف م ۱۹۲۹ء ضخامت (۸ صفحہ)۔ اس مضمون میں عہدِ عثمانی کی علمی اور تعلیمی تاریخی اہمیت کی حامل یادگار ترقیوں کی تفصیل کے ساتھ صحیح اعداد و شمار بھی فراہم کئے گئے ہیں اور دورِ محبوبی کی ترقیات سے ان کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

۴۔ ہمارے بادشاہ ذی جاہ: روزنامہ صبحِ دکن کا سالگرہ نمبر بابت ۱۳۳۹ف م ۱۹۳۰ء ضخامت (۴ صفحہ)۔ اس میں میر عثمان علی خاں سابق فرمانروائے حیدرآباد کی سوانح حیات اور ملک کے مختلف تعلیمی و انتظامی اداروں کی قابلِ ذکر ترقیوں کا سرسری خاکہ ہے۔

۵۔ تیمور کا لڑکپن: جریدۂ حسن کار جلد (۱) نمبر (۹) بابت اردی بہشت ۱۳۴۲ف م ۱۹۳۳ء ضخامت (۲۴ صفحہ) فل اسکیپ سائز۔ یہ مضمون تاریخی ہے اور اس کا مواد زیادہ تر ہیرلڈ لیمب کی مشہور عالم تصنیف (ٹمرلنگ) سے ماخوذ ہے۔ ترتیب اور اسلوب جاذبِ نظر ہے۔ اس میں امیر تیمور کے حالات آغازِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک درج ہیں جو طلبہ کی زندگی میں جوش، وجد بار اور مستقبل کو شاندار بنانے کا شوق پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

۶۔ حیدرآباد کا شاعر و مورخ: مجلۂ مکتبہ جلد (۷) شمارہ (۵) بابت فروری ۱۳۴۰ف م ۱۹۳۱ء ضخامت (۲۸ صفحہ)۔ اس مقالے میں مولوی سید علی شبیر کی حیات، تصنیفات اور شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۷۔ خاموشی: رسالہ زبان، منگرول، ضخامت (۵ صفحہ) یہ ایک اخلاقی مضمون ہے جس میں حکمائے اخلاق اور پیشوایانِ امت کے زریں خیالات سے استدلال کیا گیا ہے۔

۸۔ آصف جاہ اول: کتاب وحید جشنِ عثمانی مرتبہ محمد فاضل۔ یہ تاریخی مضمون آصفیہ خاندان کے بانی آصف جاہ اول کے اسلاف کے حالات پر مشتمل ہے۔

۹۔ حیدرآباد کی تعمیر کاری: اس مقالے میں حیدرآباد کے عثمانی دور کی تعمیری ترقی سے دنیائے اردو کو روشناس کرایا گیا ہے۔

۱۰۔ اردو کے حروفِ تہجا: روزنامہ رہبرِ دکن کا سالنامہ بابت ۱۳۴۶ف م ۱۹۳۷ء

یہ مقالہ جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے لسانی و صوتیاتی نقطۂ نگاہ سے بہت اہم ہے۔

طرب چشتی

شاہ قتیل داناپوری

اردو میں رباعی کا فن شاعری کی ابتدا سے موجود ہے متقدمین نے بھی رباعیاں لکھی ہیں اور متوسطین نے بھی اور عصر حاضر میں بھی اس کا چلن مقبول ہے۔ میر و میرزا، غالب و آتش، انیس و دبیر، اقبال و جوش اور امجد حیدرآبادی کا نام اس سلسلے میں بہ آسانی لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت ہم سرزمین بہار کے ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر شاہ قتیل داناپوری کا ایک رباعی گو فنکار کی حیثیت سے جائزہ لینے جا رہے ہیں۔ شاہ قتیل داناپوری صوبہ بہار کے ایک قدیم صوفی خانوادے کی یادگار رہیں۔ آپ کی شعری مشق نصف صدی سے زیادہ پرانی ہو چکی ہے۔ شاعری میں آپ کا سلسلہ امام بخش ناسخ سے ملتا ہے۔ شاہ قتیل اس بزم کی ایک روشن شمع ہیں جس میں شاد و آزاد اور سیماب و سائل جیسے سخن وراں جلوہ گر رہا کرتے تھے۔ اس جہت سے آپ گلستان ادب کے لئے "شراب کہن" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی سوا دو سو منتخب رباعیوں کا ایک خوبصورت مجموعہ "رباعیات خاص" معروف بہ "تصاویر مرغوب" شائع ہو چکا ہے۔ فارسی دیوان بھی چھپ چکا ہے اور اردو کے کئی دیوان مرتب شدہ ہیں۔

"رباعی" کا مادہ "ربع" ہے۔ اس میں چونکہ چار مصرعے ہوتے ہیں اس لئے رباعی کے نام سے مشہور ہے۔ رباعی کا پہلا شعر یعنی شروع کے دو مصرعے شعری توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بہت اہم ہیں۔ لیکن مقصد و مطلب کو دوسرے شعر میں جان رباعی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ خصوصاً چوتھے مصرعے میں رباعی کی روح پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی وہ سبک نشتر ہے جو غضب کی کاٹ اور بلا کا اثر رکھتا ہے۔ رباعی کی ہیئت، اس کی بحروں کی تنگی اور قیود فنی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم حضرت قتیل کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

چاک دل مجروح کبھی سل نہ سکا　　غنچہ جو ہوا خشک وہ پھر کھل نہ سکا
کیا خاک لطافت سے کثافت کا میل　　پانی میں کوئی تیل کبھی مل نہ سکا

دشمن بھی ملا رفیق و دلجو بھی ملا　　پہلو میں خوشی کے غم کا پہلو بھی ملا
شادی و غمی جہاں میں توام نکلے　　آنکھیں جو ملیں ساتھ ہی آنسو بھی ملا

کیا ظلم کے زور پر بشر لڑتا ہے　　جلتا ہے کوئی ان میں کوئی گڑتا ہے
ہے روح جو قوت بقا دے کی　　نکلی نہیں جان اور بدن سڑتا ہے

بیدار گذار دی کہ سو کر اٹھے　　دلگیر رہے کہ شاد ہو کر اٹھے
گھٹتی ہی گئی عمر کی میعاد قتیل　　ہر صبح ہم ایک رات کھو کر اٹھے

حضرت قتیل کی رباعیوں میں رباعیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ تجربات حیات، عمق نظر، بلندی فکر اور پرواز تخیل مشاہدات زندگی کو حسین و جمیل مرقعوں کی شکل میں پیش کرتے ہیں جس رباعی کو دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مصرعوں میں شاعر نے خون جگر نچوڑ دیا ہے۔ تخیل کی بے پناہ جولانی دیکھئے شاعر کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ خوبصورت اور نادر تشبیہات و استعارات کے حریری و اطلسی پردوں میں آپ کا کلام نہایت رواں، سلیس، لطیف اور اثر انگیز ہوتا ہے ایک وجد آور اور کیف پرور سماں بندھ جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہمت میں کوئی اگرچہ کوتاہی نہیں　　احساس بھی گو رنج میں کھوتا ہی نہیں
کس طرح اٹھا لیتا ہے کمزور انسان　　احساں سے بڑا بوجھ تو ہوتا ہی نہیں

تاثیر دل مخمور جلا کرتی ہے　　حسرت کف افسوس ملا کرتی ہے
ظالم کو کبھی حاجت اسباب نہیں　　گو پاؤں نہیں تیغ چلا کرتی ہے

کہتے ہیں گدا کو ہیچ کوئی ذی جاہ　　اعزاز ہے دامن میں لئے حال تباہ
ممتاز ہے اپنے کو مٹا دے جو قتیل　　پس جائے تو ہر آنکھ میں سرمے کی ہے راہ

حضرت قتیل نے اپنی رباعیوں میں اخلاقی و روحانی قدروں کو بھی بڑے حسین پیرائے میں سمو کر پیش کیا ہے۔ پند و نصیحت کا رنگ، فلسفے کی جھلک، درد و غم کا بیان، رموز عشق و محبت کا ذکر، اخلاقی نصیحتیں، مساوات و بلند کردار کی خوبیاں، رندی و سرمستی کے حالات، میخانہ بدوش فضا غرض یہ کہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کا ہر لطف بیان اور از حد دلچسپ اور فصیح و بلیغ انداز میں نظر آتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں افسردگی اور مایوسی بری سمجھی جاتی ہے کیونکہ ایک شخص کی افسردہ دلی کتنے ہی زندہ دل اور بشاش لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ شاعر افسردگی کو برا کہتے ہوئے اس سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے:

پیکان مژہ، تیر نظر چلتا ہے　　خنجر بھی، اگرچہ کم، مگر چلتا ہے
ممکن نہیں بچ سکے فسردہ جو ہو دل　　سوکھے جو شجر اس پہ تبر چلتا ہے

آنکھوں سے جو گر گیا نظر میں نہ رہا　　ہوتے ہی سحر نور قمر میں نہ رہا
دنیا میں نہیں دل فسردہ کی جگہ　　غنچہ کبھی سوکھ کر شجر میں نہ رہا

حضرت قتیل نے ایک درد مند دل پایا ہے۔ وہ انسان کو معیار انسانیت پر پورا دیکھنا چاہتے ہیں۔ نیکیوں کی ترغیب برائیوں کے عبرت ناک انجام کا خوف اور عیوب کی اصلاح چاہتے ہیں۔ وہ اشخاص میں پوشیدہ جوہر کی چمک دمک دیکھنا چاہتے ہیں جو اسے اللہ تعالیٰ نے ودیعت کیا ہے۔ ثابت قدمی، ہمدردی، نرم دل شیریں گفتاری، حرکت و عمل، صداقت، بے ریائی اور اخلاقی تعلیم ہی

شاعر کا مقصد فن ہے۔ فن اور مقصد اس طرح آپس میں شیر و شکر ہیں کہ ہر جگہ ادبی حسن چھوٹا پڑتا ہے۔

تزئین شباب و زینت شیب ہوا زیبائش چشم مست لاریب ہوا
ہے ننگ جہاں قدم میں گر بچھ دیتا سرمہ جو بہار رخ کے لئے عیب ہوا

آسان نظر آتا ہے سناں کا چرکا دشوار نہیں تیر و کماں کا چرکا
خنجر کا بھی زخم مندمل ہوتا ہے اچھا ہی نہ ہو مگر زباں کا چرکا

اللہ ہی بس ہے دل ہی گھوٹا ہو اگر کیا خاک بنے نقل کا موٹا ہو اگر
آسان ہے ابتدا میں اصلاح عیب ہر پیڑ اکھڑ سکتا ہے چھوٹا ہو اگر

دستار و عبا نہ دلق پوشی بہتر تسبیح ریا سے بادہ نوشی بہتر
جس گفت و شنود میں ہوں فتنے پنہاں اس گفت و شنود سے خموشی بہتر

محض چند رباعیوں کے ذریعہ فنکار کے نظریات کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے مگر حضرت قتیل کی رباعیوں میں ان تمام باتوں کا ایک ایسا حسین اور خوشگوار امتزاج ہے جس سے آپ کا تصوفانہ مسلک اور اسلامی شعار زندگی، سادگی طبیعت اور بلند نظری صاف نمایاں ہے۔

سہل ممتنع کی اتنی اچھی مثال شاید ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے اور وہ بھی رباعی کے فن میں۔ کہیں کہیں تو تیور کے اچھوتے پن اور برجستگی کی نرالی شان نے والہانہ دلکشی اور کلام میں بانکپن پیدا کر دیا ہے ذرا ان اشعار میں تیور کا تیکھاپن ملاحظہ ہو:

جو چاک ہو وحشت میں نہیں سلتا ہے دامن بھی جیب سے بھی جا ملتا ہے
دو شب بھی کہیں پھول نہ شاخوں میں ہے غنچہ کچھ سوچ کے اگر کھلتا ہے

تاثل سے نہ ہو دو چار اے طائر دل کمبخت کہیں تیر نظر چھوٹ نہ جائے

بھیگے شب عمر اب کہاں تک اے عمر شبنم ہوں کہ رات بھر رلایا جاؤں

ذرا اس رباعی کا لب و لہجہ سنجیدگی و متانت، درد و سوز و گداز اور انتہائی کیفیت بھی دیکھئے:

پھولوں کی فسردگی خزاں میں حق ہے دامن سے جو زر گر گیا چہرہ فق ہے
انجام زوال کا صدف سے پوچھو گوہر جو نکل گیا کلیجہ شق ہے

فن کی مہارت، زبان پر قدرت، بات بات میں ایک نئی بات پیدا کرنا، نرم و نازک اور خوبصورت لفظوں میں بڑے بڑے سنجیدہ مسائل حکیمانہ نکات اور صوفیانہ رموز دلچسپ دلنشیں اور عام فہم زبان میں اس شگفتگی اور خوبی سے بیان کرنا موصوف ہی کا حصہ ہے۔ ذیل کی رباعیاں ملاحظہ ہوں:

ہے عشق کے ساتھ ازل سے آزار کی شاخ گلشن میں ہے پھولوں کے لئے خار کی شاخ
دل ہے کہ تصور میں کٹا جاتا ہے مژگاں تہ ابرو ہے کہ تلوار کی شاخ

اللہ ری تری گرمیٔ رفتار کی آنچ دوزخ کی ہے یا برق شرربار کی آنچ
کیا قلب حزیں جلیں ابرو میں بچے زخموں کو پکا دیتی ہے تلوار کی آنچ

ہے نقش بر آب زندگانی ساقی دریا کا حباب عمر فانی ساقی
ٹٹی دھوکے کی ہے بساط دنیا دامان سراب ہے جوانی ساقی

تمہید قضا ہے عمر فانی ساقی تفصیل عذاب زندگانی ساقی
لب تک جو نہ آسکے وہ اسرار ہے یہ گونگے کا خواب ہے جوانی ساقی

پیغام فنا ہے کامرانی ساقی تصویر قضا ہے زندگانی ساقی
اپنا ہی سرور کھا گیا خود مجھ کو غنچوں کا تبسم ہے جوانی ساقی

اگر یہ صحیح ہے کہ فنکار اپنے کامیاب فن کی بدولت بقائے دوام حاصل کرتا ہے اور اسے زندگی جاوداں نصیب ہوتی ہے تو بے شک حضرت قتیل کی یہ انمول رباعیاں ان کی حیات ابدی کی ضامن ہیں۔

انگریزی زبان کی بڑھتی ہوئی اہمیت

انگریزی اس وقت ایک عالمی زبان بن چکی ہے۔ روس اور چین جیسے ملکوں کے تعلیمی نظام میں بھی اسے اب بلند مقام حاصل ہے۔

انگریزی کی بڑھتی ہوئی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی ۵۰ فی صدی سے زائد سائنسی مطبوعات انگریزی زبان میں ہیں۔ بین الاقوامی ڈپلومیسی اور تجارت کی زبان بھی انگریزی ہی ہے۔ ہوائی اور بحری جہاز رانی کے انتظامات بہت حد تک اسی زبان میں کئے جاتے ہیں۔ انگریزی کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت اس زبان کو ثانوی زبان کے طور پر پڑھنے والوں کی تعداد ان لوگوں کی تعداد سے زیادہ ہے جن کی یہ مادری زبان ہے۔

انگریزی زبان سے دنیا کی دلچسپی کے پیش نظر بی بی سی نے "انگریزی بذریعہ ریڈیو" نام کی سروس جاری کی ہوئی ہے۔ یہ سروس جنگ کے زمانے میں یورپ کے مقبوضہ ملکوں اور عرب ملکوں کے لئے چھوٹے پیمانہ پر شروع کی گئی تھی لیکن اس وقت "ٹائمز" لندن کے مطابق یہ "زبان سکھانے والی دنیا کی سب سے بڑی سروس" بن گئی ہے، جو دنیا کی ۳۴ بڑی زبانوں میں نشر کی جاتی ہے۔

بی بی سی کا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی شخص ان زبانوں میں سے اگر ایک زبان بھی جانتا ہے تو وہ اس کی سروس کی مدد سے انگریزی سیکھ سکتا ہے۔ انگریزی کے اسباق خود نشر کرنے کے علاوہ بی بی سی ان کے ریکارڈ ہر ملک کے ریڈیو اسٹیشنوں کو مفت مہیا کرتی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو نے بھی وقتاً فوقتاً یہ ریکارڈ نشر کئے ہیں۔ اس تعاون کو وسعت دینے کے لئے حال ہی میں مزید انتظامات کئے ہیں۔

بی بی سی نے اب گراموفون کورس بھی شروع کئے ہیں۔ یہ کورس ۳۴ ملکوں (بشمول ہندوستان) میں فروخت ہو رہے ہیں۔ گذشتہ سال ۳۰۰۰۰ سے زائد کورس فروخت ہوئے تھے۔ ان ریکارڈوں کے ساتھ جو نصابی کتابیں ہیں ان کو ۲۵ زبانوں (بشمول اردو) میں شائع کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں یہ کورس اورینٹ لانگ مینز لمیٹڈ دہلی، کلکتہ بمبئی اور مدراس سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

کتابوں کا تحفہ

بجلی کا بھاری سامان تیار کرنے کا جو کارخانہ بھوپال میں کھلا ہے وہاں فنی کتابوں کی ایک لائبریری قائم کی جا رہی ہے۔ معلوم ہوا ہے اس لائبریری کے لئے کولمبو منصوبے کے تحت حکومت برطانیہ ۱۱۵۰ پونڈ قیمت کی کتابوں کا تحفہ دے گی۔

مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط

مرزا مظہر جان جاناں کے فارسی خطوط اور دیگر نثری تحریروں کا اردو ترجمہ مکتبہ برہان (دہلی) نے شائع کیا ہے ترجمہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب لکچرر شعبۂ اردو کروڑی مل کالج (دہلی) نے کیا ہے۔ حواشی کے اضافے نے کتاب کی افادیت بڑھا دی ہے۔ کتاب کی قیمت چار روپے ہے۔

اُجالوں کے گیت

نئی نسل کے ممتاز شاعر سید حرمت الاکرام کی نظموں کا مجموعہ "اجالوں کے گیت" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ حلقہ ترویج ادب (نمبر ۱۹۱، ایڈن ہسپتال روڈ) کلکتہ ۱۲ نے شائع کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔

برنارڈ شا کی کتاب نئے چالیس حروف تہجی میں

ایک اطلاع کے مطابق اگلے موسم خزاں میں جارج برنارڈ شا کی کتاب Androcales and the lion نئے چالیس حروف تہجی میں چھاپی جائے گی۔ برنارڈ شا اپنی زندگی میں نئے حروف تہجی مکمل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو انھوں نے اپنی وصیت میں کچھ رقم اس کام کی تحقیق کے لئے وقف کی۔ تحقیق کے بعد ماہرین نے چالیس حروف تہجی وضع کئے ہیں۔

کتاب کے بائیں ہاتھ کے صفحات عام حروف تہجی اور دائیں ہاتھ کے صفحات نئے حروف تہجی میں چھاپے جائیں گے۔

گورکھپور میں ادبی نشست

۱۱ جنوری ۶۲ء کی شب میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ صدارت کے فرائض جناب رائے جونپوری نے انجام دئے۔ یہ نشست کلیم جہانگیری اور فیض الحسن کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔ سب سے پہلے چندر دیپ نے اپنی کہانی "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی" سنائی اس کے بعد نظموں اور غزلوں کا دور شروع ہوا۔ آخر میں جناب صدر نے اپنی مختصر تقریر میں اردو زبان کی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔

مدھیہ پردیش کی نمائش میں مشاعرہ

۱۳ مارچ ۶۲ء کی شب میں ۹ بجے سے ۳ بجے تک شیوپوری مدھیہ پردیش کی نمائش میں شاندار کامیاب مشاعرہ ہوا۔ کئی ہزار سامعین شریک مشاعرہ تھے۔ اس مشاعرہ میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی شعرا نے بھی شرکت کی۔

جھانسی میں آل انڈیا مشاعرہ

۱۱ مارچ ۶۲ء رات کو ۹ بجے جھانسی کی نمائش میں ایک شاندار کل ہند مشاعرہ ہوا جس میں مقامی اور بیرونی شعرا نے شرکت کی۔

مراسلات

اردو رسم خط

ادھر کئی ماہ سے "ہماری زبان" میں اردو کے اعراب، املا اور رسم خط کے متعلق بہت کچھ پڑھ رہا ہوں۔ متضاد خیالات کے باوجود غور و فکر کے عبرت ناک گوشے ابھر رہے ہیں۔ جناب ایم۔ اے۔ جیس، غلام رسول، محمد احسن اللہ، سید شہاب الدین، ڈاکٹر منصور الدین، عبد الودود اور ڈاکٹر محمد عقیل وغیرہ کی قابل قدر رایوں کا مطالعہ کیا۔ اردو زبان اور اردو رسم خط کے ساتھ ان حضرات کی ہمدردیوں پر کیا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ میری حقیر رائے میں رائے محبوب نارائن کی تحریر مطبوعہ "ہماری زبان" بابت ۱۵ فروری ۱۹۶۲ء بڑی جامع اور حقیقت افروز ہے۔ موصوف نے "اردو رسم خط اور اس کی فکر اصلاح" کے تحت اس گمبھیر مسئلے کا جس دقت نظر اور جن جن گوشہ ہائے فکر سے جائزہ لیا ہے وہ قابل اعتنا ہیں۔ رائے محبوب کی اس بات سے کہ "اردو خط میں ہر طرح کی صلاحیت اور لچک موجود ہے بلکہ یہ دنیا کا بہترین خط ہے"۔ انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"ہماری زبان" بابت ۸ مارچ ۶۲ء میں ڈاکٹر محمد عقیل لکھتے ہیں کہ "زبان کا رسم خط سے کوئی بڑا واسطہ نہیں ہوا کرتا" ظاہر ہے کہ اردو کو آپ چینی رسم خط میں بھی لکھ سکتے ہیں۔ اور لاطینی میں بھی۔ لیکن کسی زبان کا رشتہ اس کے اپنے رسم خط کے ساتھ جسم و جان کا ہوتا ہے۔ انسان کی روح اگر بیل کے جسم میں داخل ہو جائے تو روح انسان ہی کی رہے گی اور جسم بیل ہی کا رہے گا لیکن اس کی باتیں سمجھنے کے لئے یا تو ہمیں بیل بننا ہوگا یا اس روح کو وہی جسم دینا ہوگا جو ہمارا آپ کا ہے۔ یعنی چینی رسم خط میں لکھی ہوئی اردو پڑھنے کے لئے یا ہمیں چینی رسم خط سے واقف ہونا پڑے گا یا پھر کسی ذریعہ سے اسے اردو رسم خط میں تبدیل کرنا ہوگا۔ زبان اور رسم خط کا واسطہ ایسا ہی ہے۔ آج اردو زبان کی ترقی میں جو چیز حائل ہے وہ اردو رسم خط کے لئے بہترین ٹائپ کا نہ ہونا ہے۔

ہماری زبان بابت ۸ فروری ۶۲ء کے پہلے صفحہ پر ہی سید شہاب الدین دسنوی نے مہرجیس پٹمین کے ترمیم شدہ Augmented Roman Alphabet کی مثال دی ہے اور مروجہ رسم خط سے اس کا مقابلہ کیا ہے۔ دونوں انگریزی عبارتوں کو باری باری پڑھئے اور محسوس کیجئے کس میں دقت ہوتی ہے

"ہماری زبان" یکم فروری ۶۲ء کے پہلے صفحہ پر محمد احسن اللہ بی۔ اے نے اردو طباعت کے لئے رومن رسم خط کے لئے مجوزہ حروف پیش کئے ہیں اور چند نامانوس شکلیں دکھائی ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ کم از کم اسی Alphabet میں اردو کی چند عبارتیں ہماری زبان میں شائع کی جائیں اور اردو داں طبقے سے اس تبدیلی کے لئے رائے طلب کی جائے۔ ان مجوزہ شکلوں کے نام بھی مقرر کئے جائیں تاکہ ہجے میں گڑبڑ نہ ہو۔

میرا خیال ہے کہ خواہ مخواہ اس بحث میں پڑ کر اردو زبان و رسم خط کے لئے دقتیں اور مشکلیں مدعو کی جا رہی ہیں۔ یہ امید کہ اس تبدیلی کے ذریعے کبھی نہ کبھی وقت اردو ہندی کا جھگڑا ختم ہو جائے گا اور دونوں زبانیں ایک ہو جائیں گی موہوم ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ تبدیلی رسم خط کے لئے جو رائیں اب تک دی جا چکی ہیں ان پر عمل کیا جائے تو رفتار ترقی تیز ہو جائیگی بلکہ خدشہ ہے کہ اردو پھر دو سال پیچھے نہ جا پڑے۔

میں پھر اپنی ناقص رائے یہی پیش کروں گا کہ اردو کے موجودہ ٹائپ کو ہی سنوارا جائے، اس میں نفاست پیدا کی جائے اور اپنی نظر کو نستعلیق سے ہٹا کر اس کا عادی بنایا جائے۔ اردو کی فلاح اسی میں ہے نہ کہ حروف تہجی کی تنسیخ و تبدیلی میں اور اعراب و املا کے چکر میں۔

حلیم رضوی برق

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

شعر مندرجہ عنوان کے متعلق "سلیمان ظفر" صاحب کا مراسلہ یکم مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے شعر زیر بحث کو غالب تخلص کسی غیر معروف و نامعلوم شاعر سے منسوب کیا ہے جب کہ بر بنائے شواہد یہ قول صحت سے عاری معلوم ہوتا ہے کیونکہ میرے مراسلے کی اشاعت کے بعد ہی کیف ٹونکی کے پوتے سیف ٹونکی کے صاحبزادے جناب محمد عمر صاحب سیفی کا خط مورخہ ۹ فروری ۱۹۶۲ء راقم سطور کے نام موصول ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے غزل کی توثیق و تصدیق کی اور تحریر کیا ہے کہ :—

"آپ کا مضمون نہایت محققانہ اور واقعات کے عین مطابق ہے۔ یہ غزل کیف صاحب مرحوم کی ہے اور وہ شعر بھی"۔

پھر ۱۰ فروری ۱۹۶۲ء کے خط میں رقم طراز ہیں کہ :—

"قبلۂ محترم السلام علیکم، مختصر حالات اور شعر زیر بحث (اچھی صورت الخ) کی توثیق اور تصدیق کے متعلق عرض کر چکا ہوں اس غزل کے دیگر اشعار یہ ہیں ؎

دنیا ہستی پہ جب نظر ڈالی — آپ ہی خاک آپ پر ڈالی
یار کوئی کہیں نظر نہ پڑا — آنکھ سب پر ادھر ادھر ڈالی
پھر تمہیں سے بنائے شوخی تھی — پھر تمہیں نے بنائے شر ڈالی

مذکور الصدر رسل و رسائل کا واقعہ اس طرح پر ہے کہ جب

"تحفۂ ممتاز" میں شعر مستفسرہ میری نظر سے گذرا تو میں نے بخیال توثیق و مزید احتیاط ایک جوابی خط صولت صاحب ٹونکی کو لکھا کہ یہ صاحب میری معلومات میں تلامذۂ خاندان کیف سے تھے۔ موصوف نے جب عرصہ تک کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے اپنی معلومات کی حدود میں رہ کر مراسلہ بغرض اشاعت اخبار بھیج دیا۔ ادھر صولت صاحب نے میرا خط جواب کے لئے کیف صاحب کے خلف اصغر جناب مہر صاحب کیفی کے سپرد فرمایا۔ وہ جواب دینا بھول گئے۔ بالآخر جب اخبار میں مراسلہ محمد عمر صاحب سیفی کی نظر سے گذرا تو انھوں نے اپنے چچا صاحب کو دکھایا۔ جس پر چچا صاحب کو میرا تشنۂ جواب خط یاد آگیا اور ان کے بھتیجے جناب محمد عمر صاحب سیفی نے جناب مہر کیفی کی طرف سے "معذرت بسیار کے بعد" بذریعہ کرم نامہ راقم سطور کو مخاطب کیا۔ جس کا اقتباس سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔

پس واقعات مندرجہ کے تحت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سلیمان ظفر صاحب کو ایک "منتخب" نے علمی تسامح میں مبتلا کر دیا ورنہ شعر اور غزل مندرجہ مراسلہ راقم سطور کیف ٹونکی ہی کی ملک ہیں۔

معراج دھولپوری

بیخود بدایونی اور مضطر خیرآبادی

مجھے حضرت عبدالحی صاحب بیخود بدایونی مرحوم اور جناب افتخار حسین صاحب مضطر خیرآبادی مرحوم کی مختصر سوانح حیات درکار ہے جس میں ان حضرات کا سنہ پیدائش اور وفات تصانیف کے عنوان اور مجملاً حالات زندگی ہوں امید کہ ارباب ادب میں سے کوئی صاحب اس گزارش پر خصوصی توجہ فرماویں گے۔

حامد جبلپوری

منشی پریم چند کے ایک ناول کی تلاش

مجھے اپنے والد مرحوم منشی پریم چند صاحب کے ناول "کشنا" (مطبوعہ میڈیکل پریس بنارس ۱۹۰۷ء) کی تلاش ہے۔ ناظرین "ہماری زبان" میری رہبری فرما کر ممنون فرمائیں۔

امرت رائے ۰ ۵، ہیسٹنگز روڈ، الہ آباد

یہ شعر کس کا ہے؟

محترمہ ناصر محمد کے استفسار کے جواب میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ مندرجہ ذیل قطعہ کے یہ آخری دو مصرعے ہیں میرے ذہن میں دھندلا سا نقش ہے کہ شاید یہ قطعہ ظفر کا ہے:

بشر ز زندگی ہر گز ذلیل و خوار ہوتا ہے ۔۔۔ نکل جو تا ہے جب تو شہر کو بیکار ہوتا ہے
مثال اپنی کسی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے ۔۔۔ کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے

مندرجہ تاب چاند ایم۔ اے

تبصرہ

ماہنامہ ادیب عبدالسلام نمبر

ہمارے جن بزرگوں کو سیاسی یا قومی زندگی میں مقبولیت حاصل ہوتی ہے ان کے مرنے پر تو خیر ہماری صحافتی دنیا میں ایک چہل پہل ہو جاتی ہے۔ سنجیدہ اور وقیع مضامین نہ سہی کاروباری اور اشتہاری تحریروں کا خاصا انبار لگ جاتا ہے۔ لیکن جو بزرگ ان سعادتوں سے محروم ہوتے ہیں ان کی موت کی خبر اخبارات و رسائل کے کسی گوشے میں سیاہ حاشیوں کے ساتھ چھپ جائے تو بھی بہت ہے۔ ۱۹۵۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی کا انتقال ہوگیا وہی مولانا عبدالسلام جن کی شعرالہند کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے اور جس سے اردو ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ جن کی تصانیف سیرالصحابہ، تاریخ اخلاق اسلامی، حکمائے اسلام، سیرت عمر ابن عبدالعزیز، تاریخ الحرمین، امام رازی، ابن یمین اور اقبال کامل وغیرہ اور جن کے تراجم انقلاب الامم، تاریخ فقہ اسلامی اور ابن خلدون وغیرہ اردو زبان کے علمی سرمائے میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔ مولانا عبدالسلام ایک درویش صفت بزرگ اور گوشہ نشین عالم تھے۔ انھوں نے سیاسی اور قومی ہنگاموں سے دور دارالمصنفین اعظم گڑھ کی چار دیواری میں اپنی پوری عمر تصنیف و تالیف اور علوم اسلامی کی تحقیق و تدوین میں گزار دی۔ مرحوم کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف تو غالباً اردو کے تمام ادیبوں اور نقادوں کو ہے لیکن اس اعتراف کا خاطر خواہ اظہار نہیں کیا گیا اور جہاں تک ہمیں علم ہے ان کے انتقال کے بعد ہندوپاکستان کے ادبی حلقوں میں عام طور پر خاموشی رہی یہاں تک کہ دارالمصنفین کا رسالہ "معارف" بھی مرحوم کے نام پر کوئی خاص نمبر نکالنے سے قاصر رہا۔ البتہ شبلی کالج اعظم گڑھ نے اپنے میگزین کا ایک نمبر ان کی یاد کے لئے مخصوص کر دیا تھا جسے کبیر جائسی نے مرتب کرکے شایع کیا تھا۔ کبیر احمد جائسی نے ایک عرصہ تک مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی خدمت میں رہ کر ان سے تربیت حاصل کی ہے اس لئے انھیں مرحوم سے ذاتی طور پر عقیدت ہے اور وہ ان کی شخصی زندگی اور ان کے علمی کاموں کی نوعیت سے بخوبی واقف ہیں۔ آجکل وہ رسالہ ادیب علی گڑھ سے وابستہ ہیں اور ادیب کا زیر نظر شمارہ دراصل موصوف کا ایک طویل مقالہ ہے جس کا عنوان "ذکر عبدالسلام" ہے۔

کبیر احمد جائسی کا یہ مقالہ مولانا عبدالسلام ندوی کی شخصیت، ان کے طرز فکر، اسلوب بیان اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو ایک رشتے میں منسلک کرکے سامنے لاتا ہے۔ مقالہ نگار نے مرحوم کے تعارف کا حق ادا کر دیا ہے۔

ادیب کا یہ خاص نمبر جامعہ اردو علی گڑھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

[illegible]